فیصلہ قضایا کے بنیادی اصول

عدالتی طریقِ کار اور پالیسی

ڈاکٹر محمود احمد غازی

حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ مشہور اور جلیل القدر صحابی ہیں۔ اصل اسم گرامی عبداللہ بن قیس ؓ ہے، رہنے والے یمن کے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی ایمان لے آئے تھے، اور مکہ مکرمہ ہی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ بسے تھے۔ آپ نے حبشہ بھی ہجرت فرمائی تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد قریب قریب تمام غزوات و مہمات میں شرکت کی۔ ۹ھ میں حضور ؐ نے آپ کو یمن کے علاقوں: زبید اور عدن کا گورنر مقرر فرمایا۔ ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق ؓ نے آپ کو بصرہ کا گورنر اور صدر قاضی مقرر کیا۔ اس حیثیت میں آپ نے بہت سے تاریخی کارنامے انجام دیے۔ حضرت عمر ؓ کو اپنے جن حکام و قضاۃ پر بہت گہرا اعتماد تھا، ان میں سے ایک حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ بھی تھے۔ حضرت عمر ؓ ان کو وقتاً فوقتاً خطوط اور مراسلے لکھتے رہتے تھے، جن میں سے بعض کا ذکر حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ چند ایک کا متن بھی محدثین و مورخین نے محفوظ رکھا ہے۔ خود حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ کا طریقہ تھا کہ حضرت عمر ؓ کے ان تمام خطوط کی نقلیں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد، ان کی وصیت کے مطابق، یہ قیمتی ذخیرہ ان کے صاحبزادے، حضرت ابو بردہ ؓ کو مل گیا۔ وہ ان خطوط کی روایت بھی کیا کرتے تھے اور مشتاقانِ علم کو ان کی نقلیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ سفیان بن عیینہ (مشہور محدث، م ۱۹۸ھ) بیان کرتے ہیں: ابو عبداللہ بن ادریس، ابو بردہ ؓ کے صاحبزادے سعید بن ابی بردہ کے ہاں گئے، اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ مجھے وہ خطوط دکھا دیں جو حضرت عمر ؓ نے آپ کے دادا حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ کو لکھے تھے۔ سعید بن ابی بردہ بہت سے خطوط نکال کر لائے، ان میں ایک اہم خط قضایا کے فیصلوں کے لیے عدالتی طریق کے اصولوں کے بارے میں تھا۔ اس تحریری شہادت کے علاوہ تابعین کی ایک بڑی تعداد نے اس خط کی زبانی روایت بھی کی ہے۔

ذیل میں یہ تاریخی دستاویز اور اس کے اہم مباحث کی، حافظ ابن قیم کی مفصل شرح سے ماخوذ تلخیص

پیش کی جارہی ہے ۔ یہ اصول صرف عدالتی قضایا ہی کے لیے نہیں بلکہ گھریلو، معاشرتی، بین الانسانی اور تمام اجتماعی تعلقات اور قضایا کے لیے انتہائی قیمتی راہ نمائی فراہم کرتے ہیں ۔ (مدیر)

(۱) جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو تو تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو

جاننا چاہیے کہ کوئی مفتی یا حاکم عدالت اس وقت تک نہ تو حق کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے اور نہ فتویٰ جاری کر سکتا ہے، جب تک اس کو فہم صحیح کی نعمت سے نہ نوازا جائے ۔ فہم صحیح اور نیک نیتی، یہ دو اللہ تعالیٰ کی جلیل القدر اور عظیم الشان نعمتیں ہیں ۔ صحیح اسلام کی بنیاد یہی دونوں چیزیں ہیں اور اسلام کی اساس ان دونوں پر ہی قائم ہے ۔

۱۔ سب سے پہلے تو اس واقعہ کی، جو پیش آیا ہے، صحیح سمجھ ۔ یہ سمجھ قرائن، علامات اور دوسری نشانیوں پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے ۔

۲۔ دوسرے اس بات کی سمجھ کہ اس پیش آمدہ واقعہ میں کیا کرنا چاہیے، یعنی اس معاملے میں وہ حکم شرعی کیا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ؐ سے معلوم ہوتا ہے ۔

اس کے بعد ان دونوں کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کا مرحلہ آتا ہے ۔ اب جو شخص بھی اس معاملے میں مقدور بھر کوشش کرے گا، اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس میں بروئے کار لائے گا، وہ ایک یا دوگنے اجر کا ضرور مستحق ہو گا ۔ حقیقی عالم وہی ہے جو واقعہ کا صحیح فہم حاصل کر کے اس میں غور و فکر کرے، اور اس کے ذریعے اس کو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا حکم بھی پتا چل جائے ۔ بالکل اس طرح جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں گواہ نے ان کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھ کر فوراً یہ پتا لگا لیا کہ حضرت یوسف بالکل بری اور پاک دامن ہیں، اور اپنے بیان میں سچے ہیں ۔ یا جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے، یہ کہہ کر کہ چھری لاؤ، میں اس بچے کو کاٹ کر تم دونوں میں تقسیم کر دوں، بچے کی دعوے دار دونوں عورتوں میں سے اس کی اصلی ماں کو پہچان لیا ۔ یا جس طرح حضرت علی ؓ نے اس عورت سے، جو حاطب بن ابی بلتعہ ؓ کا خط لے کر جا رہی تھی، یہ کہہ کر خط برآمد کر لیا کہ اگر تو نے خط نکال کر نہ دیا تو ہم تجھے برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے ۔

جو شخص بھی شریعت کے احکام اور صحابہ کرام ؓ کے فیصلوں کا بغور مطالعہ کرے گا، اس کو جا بجا یہی نکتہ کارفرما ملے گا ۔ لیکن جو شخص اس نکتہ کو سمجھے بغیر یہ کام کرے گا، وہ لوگوں کے حقوق بھی ضائع کرے گا، اور شریعت کو بھی بدنام کرے گا، اور اس کی طرف غلط باتیں بھی منسوب ہوں گی ۔

۲۔ جو حق نافذ نہ کیا جا سکے اس کے بارے میں باتیں بنانے سے کچھ حاصل نہیں

حضرت عمر ؓ کا مقصود یہاں حق کے نفاذ کی اہمیت ظاہر کرنا ہے ۔ اگر حاکم عدالت کسی کے حق کو

تسلیم تو کرے ، لیکن یا تو اس کو نافذ نہ کرے یا نافذ کرنے کی اس میں قدرت و اہلیت نہ ہو ، تو پھر محض زبانی اس کو تسلیم کرنا بے کار ہے ۔ حق دار کو اس تسلیم کرنے سے آخر کیا فائدہ ہو گا؟

۳۔ اپنی نشست و برخواست اور چہرے کے تاثرات تک میں لوگوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم رکھو تاکہ کوئی بااثر آدمی یہ غلط امید نہ رکھے کہ تم سے کسی کے خلاف کوئی زیادتی کرا لے گا ، اور کوئی کمزور شخص اس سے مایوس نہ ہو کہ اس کو تمہارے ہاں سے عدل و انصاف ملے گا ۔ اور اسی طرح کوئی کمزور شخص تمہاری سختی سے خوفزدہ نہ ہو ۔

۴۔ بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور قسم اس شخص کی ذمہ داری ہے جو دعوی کی صحت سے انکار کر رہا ہو

قرآن مجید ، احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال میں جہاں بینۃ کا استعمال ہوا ہے ، اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو حق کو پورے طور پر واضح اور ثابت کر دے ۔ مثال کے طور پر: لقد ارسلنا رسلنا بالبینات ، ہم نے اپنے رسولوں کو واضح اور کھلی نشانیاں دے کر بھیجا ہے ۔ قرآن مجید میں کسی بھی آیت میں بینۃ کا لفظ گواہوں کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ۔ لہٰذا جب بھی ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے مدعی سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس بینہ ہے ، یا اس خط میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ بینہ مدعی کے ذمہ ہے ، تو ان سب جگہ بینہ سے مراد ہے وہ واضح اور حتمی ثبوت جس سے کسی دعویٰ یا بیان کی صداقت واضح ہو جائے ۔ لہٰذا اس لفظ کے عمومی معنی اور مفہوم کو گواہوں کی طے شدہ تعداد سے محدود کرنا صحیح نہیں ۔ گواہی بھی بینہ کی بہت سی اقسام میں سے ایک ہے ۔ بینہ کے ان بہت سے معانی کو ختم کر کے صرف گواہی کے معنی لینے کے بڑے خطرناک نتائج نکلتے ہیں ، اور بہت سے حقداروں کی حق تلفی ہوتی ہے ۔ ہر معاملے میں گواہوں پر اصرار کرنے اور دیگر ذرائع ثبوت کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے ظالم اور حق ناشناس لوگوں کو صرف اس وجہ سے کھیل کھیلنے کا موقعہ ملا کہ ان کو یقین تھا کہ ان کی حرکت کی گواہی دینے والے دو گواہ دستیاب نہ ہوں گے ۔ اگر بینہ کے قرآنی معنی و مفہوم کو سامنے رکھا جاتا تو یہ صورت پیدا نہ ہوتی ۔

۵۔ لوگوں (مسلمانوں) کے درمیان ہر قسم کی صلح ، مصالحت یا راضی نامہ جائز ہے ، سوائے اس صلح یا راضی نامہ کے ، جو کسی حرام کو حلال کر دے یا کسی حلال کو حرام کر دے ۔

یہی بات رسول اللہ ؐ نے بھی بیان فرمائی ہے ۔ انھی الفاظ میں ، ایک دوسرے جملے کے اضافے

کے ساتھ--- مسلمانوں کے درمیان جو بھی شرائط طے ہوں وہ باقی رکھی جائیں گی۔ سوائے ان شرائط کے جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کر دیں--- یہ حدیث ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت عمرو بن عوف ؓ المزنی کے حوالے سے روایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی صلح اور مصالحت کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں بین الاقوامی معاملات سے لے کر گھریلو اختلافات تک تمام مسائل کو صلح صفائی سے حل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ رسول اللہ ؐ نے بارہا صحابہ کرام ؓ کے درمیان پیدا ہو جانے والے اختلافات کو صلح اور راضی نامہ سے طے کرایا۔

اسلامی شریعت میں حقوق کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: ۱۔ حقوق اللہ ' ۲۔ حقوق العباد۔ حقوق اللہ میں کسی قسم کی صلح یا راضی نامہ کی گنجایش نہیں۔ مثلاً حدود کا نفاذ' زکوٰۃ کی ادائیگی اور کفارہ کی ادائیگی وغیرہ میں کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ ان معاملات میں بندہ اگر اللہ تعالیٰ سے صلح کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان حقوق کی انجام دہی میں پوری پوری کوشش کرے ' اور کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حدود کے مقدمات عدالت میں دائر ہو جائیں یا حکام (مثلاً پولیس) کے نوٹس میں آجائیں ' تو پھر سفارش کرنے والے اور سفارش سننے والے دونوں پر خدا کی لعنت۔

اس کے برعکس حقوق العباد میں صلح کی بھی گنجایش ہے ' ایک شخص اپنا حق معاف بھی کر سکتا ہے ' اور اس کا کوئی معاوضہ بھی لے سکتا ہے ' لیکن مصالحت ایسی ہونی چاہیے جو عادلانہ ہو ' انصاف پر مبنی ہو ' ظلم و زیادتی پر مبنی نہ ہو ' خود قرآن مجید کہتا ہے: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ ' ان دونوں کے درمیان عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو۔ لیکن اگر یہ مصالحت غیر منصفانہ ہو ' تو پھر وہ سراسر ظلم ہو گی۔

بعض اوقات لوگ مصالحت کرتے وقت ایسی شرائط رکھ دیتے ہیں جن کا اثر شریعت کے مقرر کردہ حلال و حرام پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً جن کی بنیاد سود خوری یا کسی حد شرعی کی موقوفی یا ایسی ہی کسی چیز پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی ہر شرط ظالمانہ سمجھی جائے گی ' اور مسترد کر دی جائے گی۔ جائز صلح کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ایسی شرائط ہوں جن سے اللہ کی رضا بھی حاصل ہو اور بندے بھی خوش ہو جائیں۔ جو شخص یہ صلح کرائے ' اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو واقعہ زیر بحث کی تمام تفصیلات کا علم ہو ' ایسے واقعہ میں کیا کرنا چاہیے اس کو جانتا ہو ' اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر یہ سب صفات اس شخص میں موجود ہوں ' تو ایک حدیث مبارک میں رسول اللہ ؐ نے ایسے ہی صلح کرانے والے کو دن روزہ دار و شب زندہ دار سے بہتر قرار دیا ہے۔

۶۔ اگر تم نے کل کوئی فیصلہ کیا ھے اور آج تم نے اس پر دوبارہ غور وفکر کیا ھے ، اور تم کو راہ راست کی طرف راہ نمائی حاصل ہو گئی ھے ، تو محض یہ بات کہ تم ایک فیصلہ کر چکے ہو ، تمھیں ہرگز ہرگز حق کی طرف رجوع کرنے سے باز نہ رکھے ، اس لیے کہ یاد رکھو حق ایک اٹل حقیقت ھے ، اس کو کوئی دوسری چیز باطل یا غلط نہیں ٹھہرا سکتی ، اور یاد رکھو کہ باطل پر اڑے رھنے سے کہیں بہتر ھے کہ حق کی طرف رجوع کر لیا جائے ۔

یعنی اگر حاکم عدالت اپنے اجتہاد کی روشنی میں آج کوئی فیصلہ کرتا ہے اور کل مزید غور وفکر کرنے سے یا مزید مطالعہ کرنے سے یا کچھ اور نئی معلومات و حقائق سامنے آنے سے وہ اپنی رائے بدل لیتا ہے ' تو اس کو دوسری رائے پر عمل کرنے میں کسی جھجک ' خوف یا شرم کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے ۔ مسلمان کی شان ہی یہ ہے کہ جوں ہی اس کو حق کا علم ہو فوراً اس کی طرف پیش قدمی کرتا ہے ۔ اور سابقہ تمام تعصّبات کو جھٹک کر پھینک دیتا ہے ۔ ایسے ہی ایک موقع پر خود حضرت عمرؓ نے ایک ملتے جلتے معاملے میں بعد میں جو فیصلہ کیا ' وہ ان کے ایک سابقہ فیصلے سے مختلف تھا ۔ اس پر ایک شخص نے کہا: آپ نے فلاں فلاں موقع پر تو یہ فیصلہ نہیں کیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: تلک علی ما قضینا یومئذ ، وھذہ علی ما قضینا الیوم ' وہ معاملہ اس طرح طے ہوا جیسے ہم نے اس وقت فیصلہ کیا تھا ' اور یہ معاملہ ایسے طے ہو گا جیسے ہم آج فیصلہ کر رہے ہیں ۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے سابقہ فیصلے کو بھی بحال رکھا لیکن اس کو دوسرے فیصلے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا ۔

۷۔ جن معاملات میں قرآن و سنت کی کوئی ھدایت موجود نہیں ، اور تمھارے دل میں کھٹکتے ھیں ، ان کے بارے میں خوب غور وفکر اور سمجھ سے کام لو ، ایسے نئے نئے مسائل حل کرنے کے لیے تم پہلے قرآن وسنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پھر نئے معاملات کو ان اصولوں پر قیاس کر لو ، اس کے بعد جو حل تمھاری رائے میں اللہ کو زیادہ محبوب ، اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ھو ، اس کو اختیار کر لو ۔

اس فقرے کی شرح میں ابن قیم نے حامیان قیاس اور مخالفین قیاس کے دلائل پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے ۔ یہ پوری بحث ' قانون ' عدالت اور ضابطے کے بجائے اسلام کے اصول قانون کے اہم باب ' ماخذ قانون سے تعلق رکھتی ہے ' اس لیے ہم اس کو چھوڑتے ہیں ۔ اس فقرے کی شرح میں امام سرخسی کے تشریحی نوٹ کا خلاصہ یوں ہے:

قاضی کو ایسے تمام معاملات کا ' جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہ ملتی ہو '

فیصلہ محض اندازاور ظن وتخمین سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ پوری تحقیق اور تلاش وجستجو کے بعد رائے قائم کرنی چاہیے۔ اس تاکیدی ہدایت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کو ازخود منصب قضا کے قبول کرنے میں سرگرمی نہیں دکھانی چاہیے۔ لیکن اجتہادی صلاحیت رکھنے کے باوجود ایسے مسائل آسکتے ہیں جن کے حل کرنے میں اسے دقت پیش آئے، اس لیے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ؐ میں دیے گئے احکام بہرحال معدود و محدود ہیں، جب کہ مسائل و واقعات بے شمار و لامحدود ہیں۔ ایسی صورت میں کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہو گا کہ ان محدود احکام میں سے کسی حکم کا کسی واقعہ پر اطلاق و انطباق کرنے میں دقت پیش آئے۔ اس دقت کو غور و فکر اور تدبر و تامل ہی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس تدبر و تامل کے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہونے چاہییں جو اس کو صحیح رخ پر ڈال سکیں۔ ایسے ہی ایک قاعدے کی طرف حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا فقرے میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی پہلے ان کلیات اور اصول کی معرفت حاصل کرو جن کے تحت قرآن و سنت کے احکام منضبط ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کلیات و اصول کی، جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، معرفت اور پہچان حاصل کرو۔ اس کے بعد تمھارے لیے کام آسان ہو جائے گا، اور جب بھی کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگی، تم فوراً ان اصول و کلیات اور ان اشباہ و نظائر میں سے کسی کے تحت، اس کو لے آؤ گے، اور اس کا حکم اس نئی صورت حال پر بھی منطبق کر لو گے۔ یہ کام کرنے کے بعد تم دیکھو، کہ نئی صورت حال پر کون کون سے اصول و کلیات اور کون کون سے اشباہ و نظائر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ان سب میں جو حکم تمھاری رائے میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب، اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ ملتا معلوم ہو، اس کو اختیار کر لو۔ یہی قیاس کا بنیادی اصول ہے اور اس پر فقہ اسلامی کے چوتھے اور اہم ماخذ قیاس کی عمارت قائم ہے۔

۸۔ جو شخص تمھارے سامنے یہ دعوی کرے کہ اس کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی حق بات موجود ہے، جو وہ اس وقت پیش کرنے سے قاصر ہے، تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اس بات کو پیش کر سکے۔ اس مہلت کے اندر اندر اگر وہ کوئی ثبوت لے آیا تو وہ اس کی بنیاد پر اپنا حق لے لے گا، ورنہ بصورت دیگر تمھارے لیے جائز ہو گا کہ تم اس کے خلاف فیصلہ دے دو۔

ایسا کرنا دراصل عدل و انصاف کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے کے مترادف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدعی کے پاس ثبوت ہوتا ہے لیکن فوری طور پر اس کو عدالت میں پیش کرنا مدعی کے لیے

ممکن نہیں ہوتا۔ اگر جلد بازی میں فیصلہ کیا جائے ' اور مدعی کو ثبوت پیش کرنے کا موقع نہ دیا جائے ' تو اس کا حق مجروح ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر وہ اس کام کے لیے مہلت طلب کرے ' تو اس کو مہلت دینی چاہیے۔ اس مہلت کی کوئی متعین مدت مقرر کر دینا مناسب نہیں۔ بعض فقہا نے تین دن کی مدت جو تجویز کی ہے وہ بھی ضروری معلوم نہیں ہوتی ' بلکہ مقدمے کی نوعیت کے پیش نظر عدالت خود ہی کوئی مناسب وقت مقرر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر عدالت کو کسی وجہ سے یقین ہو جائے کہ یہ شخص محض مقدمے کو طول دینا اور فریق مخالف کو پریشان کرنا چاہتا ہے ' تو پھر عدالت کو چاہیے کہ ایسے شخص کو کوئی مہلت نہ دے بلکہ فوراً ہی فیصلہ سنا دے ' اس لیے کہ مہلت دینا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ عدل کے تقاضے پورے ہوں۔ اگر مہلت کی وجہ سے عدل کے تقاضوں کو نقصان پہنچے تو پھر مہلت کی درخواست پر غور نہ کیا جائے۔

۹۔ مسلمان سب کے شب عادل ھیں اور ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف قابل قبول ھے ، سوائے اس کے جس کو کوئی سزائے حد دی گئی ھو ، یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ھو چکا ھو کہ وہ جھوٹی گواھی دیتا ھے ، یا اس (کی جانب داری) کے بارے میں کوئی بدگمانی اس وجہ سے کی جا رھی ھو کہ وہ صاحب معاملہ کا (جس کے حق میں گواھی دے رھا ھے) کوئی رشتہ دار یا تعلق دار ھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امت وسط قرار دیا ہے۔ وسط کے لفظی معنی یہی ہیں کہ وہ بہترین چیز جو راست پر ہو ' اور بیچ کی راہ پر عمل پیرا ہو۔ قریب قریب یہی معنی عدل کے بھی ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان ' امت وسط کا رکن ہونے کی وجہ سے عادل ہے ' سوائے اس شخص کے جس نے کسی وجہ سے اپنی صفت عدل کو خود مجروح کر لیا ہو۔ مثلاً جھوٹی گواہی دے کر لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ اسی طرح جس پر کوئی سزائے حد جاری ہو چکی ہو ' اس کو گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے حد جاری شدہ لوگوں کی گواہی قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے ' اسی طرح جس شخص کے بارے میں یہ گمان کرنے کے مضبوط وجوہ موجود ہوں ' کہ وہ مشہود لہ (جس کے حق میں گواہی دی جا رہی ہے) سے اس کی گواہی کے عوض کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے ' تو اس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک رشتہ داروں کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی کا تعلق ہے ' تو اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا اس بنا پر رشتہ داروں کی گواہی کو ہر صورت میں قبول کرنے کی طرف مائل ہیں کہ قرآن مجید یا سنت ثابتہ میں ایسی کوئی صراحت نہیں کہ رشتہ داروں کی گواہی رشتہ داروں کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ یہ رائے امام ابو محمد بن حزم اور دوسرے ظاہری فقہا کی ہے۔ بعض فقہا کے

نزدیک (جن میں امام شافعی اور امام احمد شامل ہیں) ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، بیٹا بیٹی، پوتا پوتی اور نواسا نواسی کی گواہی کے علاوہ، بقیہ سب رشتہ داروں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں جائز ہے۔ کچھ دوسرے فقہا کے نزدیک، اگر کسی رشتہ دار کے بارے میں فریق مخالف کو یہ بدگمانی ہو کہ وہ جانب داری سے کام لے گا تو پھر اس کی گواہی مسترد کر دی جائے گی، اور اگر ایسی کوئی بدگمانی نہ ہو تو پھر رشتہ داروں کی گواہی قابل قبول ہے۔

یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اگر ایک شخص ایک بار بھی جھوٹی گواہی کا مرتکب ہو جائے، تو آیندہ اس کی کوئی گواہی بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ جھوٹی گواہی کتنا بڑا جرم ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شرک اور جھوٹی بات کو ایک ہی سلسلہ بیان میں ذکر فرمایا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو بہت بڑے بڑے کبیرہ گناہوں کے بارے میں بتاؤں؟ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ؐ ضرور ارشاد فرمایئے۔ آپ ؐ نے فرمایا، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، پھر والدین کی نافرمانی کرنا۔ (یہ فرماتے وقت رسول اللہ ؐ تکیہ لگائے تشریف فرما تھے)، پھر سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا، یاد رکھو اور جھوٹی بات، یاد رکھو اور جھوٹی بات۔ ان الفاظ کو آپ ؐ بار بار فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہمارے دلوں میں خیال آیا کہ کاش اب حضور ؐ بس فرمائیں۔

حسن بن زیاد اپنے استاد حضرت امام ابو حنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک روز محارب بن دثار کی عدالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمی آئے، ان میں سے ایک نے دوسرے کے خلاف کچھ رقم کا دعویٰ کیا۔ مدعا علیہ نے دعویٰ کی صحت سے انکار کیا اور مدعی سے ثبوت طلب کیا۔ اس پر ایک شخص آگے بڑھا اور مدعا علیہ کے خلاف گواہی دی۔ مدعا علیہ نے گواہ کا بیان سن کر کہا: "نہیں، قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس شخص نے میرے خلاف حق کے مطابق سچی گواہی نہیں دی، میں تو اس کو ایک نیک شخص کے طور پر ہی جانتا ہوں، لیکن اس سے یہ لغزش ہو گئی ہے، جو اس نے اس ناراضی کی بنا پر کی ہے، جو اس کے دل میں میرے خلاف موجود ہے"۔ محارب یہ ساری گفتگو تکیہ لگائے سن رہے تھے، یہ آخری بات سن کر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے "اے شخص، میں نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے، فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے، تمام انسانوں پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، حاملہ عورتوں کے حمل ان کے پیٹوں سے گر جائیں گے، پرندے اپنی دموں اور پروں کو پھڑپھڑاتے ہوں گے، اور ان کے پیٹوں میں بھی جو کچھ ہو گا، سب باہر آ جائے گا، یہ سب اس دن کی شدت اور سختی کے ڈر

سے ہو گا' یہ ان لوگوں کا حال ہو گا جنھوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس دن جھوٹا گواہ جب حساب کے لیے پیش ہو گا تو جوں ہی اس کے قدم زمین پر ٹکیں گے 'اس کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ پس اگر تو نے سچی گواہی دی ہے تو اللہ سے ڈر اور اپنی گواہی پر قائم رہ' اور اگر تو نے جھوٹی اور بے بنیاد گواہی دی ہے تو اللہ سے ڈر اور منہ ڈھک کر اس دروازہ سے باہر چلا جا"۔

۱۔ جہاں تک (گواھی کے معاملے میں) لوگوں کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کا تعلق ھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی ھے - اب تمھاری ذمہ داری صرف یہ ھے کہ پیش کردہ ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ کرو - اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حدود سے بچا لیا ھے کہ سوائے واضح اور مضبوط ثبوت یا قسم (حلفیہ اقرار) کے حد جاری نہیں ہو سکتی -

یعنی جو شخص اپنے ظاہری اطوار و عادات اور عام چال چلن میں اچھا ہو' اس کو ہمیں اچھا سمجھنا چاہیے' اور اس کی گواہی قبول کر لینی چاہیے۔ اس کے دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر وہ شخص اپنے دل میں برا ہے' تو اللہ اس سے خود نمٹ لے گا۔ جہاں تک معاملات دنیا کا اور بالخصوص عدالتی معاملات کا تعلق ہے' تو اس کا فیصلہ لوگوں کے باطن پر نہیں بلکہ ظاہر پر ہوتا ہے۔ ان معاملات میں لوگوں کا ظاہر اصل ہے اور باطن اس کے تابع ہے۔ لیکن جب آخرت میں اصل فیصلہ ہو گا تو لوگوں کا باطن اصل ہو گا اور ظاہر اس کے تابع ہو گا۔

عراق کے بعض فقہا' بشمول امام ابو حنیفہ' نے حضرت عمرؓ کے اس قول کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہر اس مسلمان کی گواہی قبول کر لی جائے جس میں کوئی شک والی بات نہ ہو' چاہے وہ کتنا ہی انجان اور نامعلوم ہو۔ لیکن حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہمارے (ابن قیم کے) خیال میں یہ مطلب نہیں نکلتا۔ خود حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ اسلام میں کسی شخص کو برے گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا' اس لیے کہ ہم سب صرف عادل گواہوں کو قبول کرتے ہیں۔ یہاں حضرت عمرؓ نے مثبت طور پر عادل گواہ کی گواہی کو قبول کرنے کا ذکر کیا ہے' اس سے عراق کے ان فقہا کی رائے کی تائید نہیں ہوتی۔

(کمرہ عدالت میں) غصہ سے پرھیز کرو، تنگ دلی اور پریشانی سے بچو، لوگوں کی مقدمہ بازی سے اکتاھٹ اور تکلیف محسوس نہ کرو، اس لیے کہ یہی وہ مواقع ھیں جہاں تمھیں حق نافذ کرنا ھے - یہ کام تمھارے لیے اللہ کے ھاں اجر کا موجب اور آخرت میں بہترین ذخیرے کا سبب بنے گا - جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان حق کے معاملے میں

نیت کو صاف اور خالص کر لیتا ھے ، چاھے اس کا نتیجہ اس کے اپنے ھی خلاف پڑ رھا ھو ، تو اللہ تعالی اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملات کو بھی صاف اور خالص کر دیتے ھیں - لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص دنیا کے سامنے خود کو اس طرح مزین کر کے پیش کرے گا کہ اصل حقیقت ، جس کو اللہ تعالی خوب جانتا ھے ، اس سے مختلف ھو ، تو ایسے شخص کو اللہ تعالی رسوا کرے گا - اس لیے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں سے صرف وھی عبادت قبول کرتا ھے جو خالص اسی کے لیے ھو - تو بتاؤ ، تمھارا کیا خیال ھے ، اس اجر و ثواب کے بارے میں جو اللہ تعالی نے دنیاوی رزق اور اخروی خزائن رحمت کی شکل میں بندوں کے لیے محفوظ کر رکھا ھے ، کیا اس کا مستحق کوئی غیر مخلص شخص ھو سکتا ھے - والسلام علیکم -

---

"اللہ تعالیٰ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے ' اجاڑی جائے اور اس کو بدنظمی سے ' گندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے" (بناؤ اور بگاڑ : سید مودودی)

آج ہم اس صورت حال سے دوچار ہیں - پوری قوم ایک عذاب میں مبتلا ہے - کراچی انسانوں کی قتل گاہ بنا ہوا ہے - خوف و دہشت کے مہیب سایوں نے اس عروس البلاد کی خوشیوں اور روشنیوں کو نگل لیا ہے --- ملک کی مجموعی صورت حال بھی ہمیں تباہی کی طرف لیے جا رہی ہے - ان حالات کی اصلاح کیسے ہو؟ یہ جاننے کے لیے

مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ کی تاریخی تقریر

"بناؤ اور بگاڑ"

کا مطالعہ کیجیے - اسے خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے -

جماعت اسلامی پاکستان